سیرت النبی کے سیاسی پہلو

پروفیسر ڈاکٹر محمد خالد مسعود
چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل،
اسلام آباد

اسلامی دنیا میں ایک عرصے سے یہ بحث چل رہی ہے کہ اسلام اور سیاست میں باہمی تعلق کیا ہے۔ یہ بحث اکثر سیرت نبی اکرم ﷺ کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔جامعة الازہر کے بعض علماء نے بیسویں صدی کے آغاز میں یہ صراحت کی کہ نبی اکرم کی بعثت کا اصل مقصد رشدو ہدایت تھا تا کہ انسان دنیا اور آخرت میں سر خرو ہو سکے۔ دولت، ریاست اور سیاست اسلام کا مقصود نہیں۔ اسلامی تاریخ میں بہت سے علماء اس کے قائل رہے ہیں ۔ لیکن جدید علماء کی اکثریت نے اس خیال کی مخالفت کی ۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں ایک سیاسی نظام کا قیام عمل میں آگیا تھا اس لئے یہ کہنا تومشکل ہے کہ اسلام کا سیاست سے تعلق نہیں ہے۔ البتہ بحث اس بات پر رہی ہے کہ اس تعلق کی نوعیت کیا ہے۔

دوسری اور تیسری اسلامی صدی میں ہی اہل علم سیاست کی اصطلاح استعمال کرنے لگے تھے۔ اس دور میں اس کا مفہوم بنیادی اصول، مقاصد یاآج کی اصطلاح میں پالیسی تھا جو قانون سازی، امور حکومت اور جزا اور سزا کے لئے رہنما اصول متعین کرے۔ دوسرے الفاظ میں سیاست اسلامی نظام کی اعلی اور بنیادی اقدار کی سوجھ بوجھ کا نام تھا۔ سیاست کے حوالے سے اس زمانے میں ایک بہت اہم بحث یہ چلی کہ سیاست عادلانہ بھی ہو تی ہے اور ظالمانہ بھی۔ ظالمانہ سیاست حاکموں کے جبر و استبداد کو جائز قرار دیتی ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ لوگوں کی سلامتی اور حکومت کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے سختی اور جبر ضروری ہے۔ ابن خلدون نے آٹھویں صدی ہجری میں ایک اور بحث کا ذکر بھی کیا ہے کہ سیاست دو قسم کی ہوتی ہے،

سیاست دینیه اور سیاست عقلیه۔ سیاست دینیه میں عدل اور قانون کے معیار وحی الٰہی سے اخذ کئے جاتے ہیں اور سیاست عقلیه میں عقلاء اور اہل الرائے یه قانون بناتے ہیں۔اختلاف اس بات پر تھا که ان میں سے مسلمانوں کوکس قسم کی سیاست اختیار کرنا چاہئے۔ علماء کی بہت بڑی تعداد کا کہنا تھا که ہر وہ سیاست جو عادلانه ہو اسلامی ہے کیونکه اسلام میں جبر و استبداد کی اجازت نہیں۔ تاہم اکثریت سیاست دینیه یا سیاست شرعیه کی قائل رہی ہے ۔ ان کے نزدیک عادلانه اور ظالمانه کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کیونکه عدل کا معیار شریعت ہی طے کرتی ہے۔

اہل علم کی ان باتوں سے یه واضح ہوا که سیاست اور دین میں جو رشته ہے وہ بہت نازك ہے اس پر اگر عدل و انصاف کی بے تعصبی اور قانون کی حکمرانی کی پابندی نه لگائی جائے تو یه نازك توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں که یا تو دین میں سیاست کو اس طرح داخل کر دیا جاتا ہے که سیاست کو عبادت اوردین قرار دے دیا جاتا ہے اور سیاست کو دین کے تابع کرنے کی بجائے دین کو سیاست کا تابع بنا دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہئے که مذہب میں سیا ست کوٹ کوٹ کر بھر دی جاتی ہے اور اسے اسلام کے سیاسی نظام کا نام دیا جاتا ہے ۔ یا دوسری جانب یه ہوتا ہے که دین کو سیاست کے تابع بتایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ایسی بے مہار سیاست کورواج دیا جاتا ہے جو کسی اعلی قدر کی پابندی کی بجائے محض اقتدار کو منزل مراد سمجھتی ہے۔ اس افراط و تفریط کی وجه سے یه نظریه بھی سامنے آتا ہے که دینی اقتدار اور سیاسی اقتدار میں تفریق ضروری ہے ۔ مذہبی سیاست کے قائل دینی اقتدار کی برتری کی بات کرتے ہیں‌تو دوسرے لوگ سیاسی اقتدار کی برتری کی۔ در اصل یه دو انتہائیں ہیں جو سیرت کے بنیادی اصول سیاست یعنی عدل و انصاف کی حکمرانی اور جبر و استبداد کی بیخ کنی کی مرکزیت کو نظر انداز کر نے سے وجود میں آئی ہیں۔سیا ست دینی ہو یا غیر دینی دونوں کا واسطه اقتدار سے ہے۔ جب سیاست کا مقصد محض اقتدار ہو اور اقتدار کو عدل کا پابند نه رکھا جائے تو دینی سیاست اور دینی اقتدار بھی جبر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

سیرت النبی کے سیاسی پہلو وں کے مطالعے سے یه بات سامنے آتی ہے که سیاست ایک با مقصد طویل سفر کا نام ہے ۔ اس کی منزل مقصود عدل و انصاف ہے لیکن اس کے حصول کے لئے اس سفر میں کئی پڑاؤ آتے ہیں ۔ ہر مرحلے پر دو طرح کے مقاصد سامنے رہتے ہیں ایک فوری جو ہر پڑاؤ سے جڑا ہوتا ہے اور ایک دیر پا جو سفر کی منزل مقصود سے وابسته ہوتا ہے۔ ہر پڑاؤ کے ساتھ مزاج اور نظر میں وسعت آتی ہے اور مقاصد زیادہ عالمگیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے سیرت نبی اکرمؐ کو ایک تسلسل میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

یه کہانی بعثت نبوی سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ نبی اکرم کا عہد شباب ہے۔ بقول ابن ہشام حضرت محمد ﷺ کی عمر پندرہ سال تھی جب مکه اور اس کے اطراف میں فجار کی جنگوں کا سلسله شروع ہوا اور آپ کی بیس سال کی عمر تک جاری رہا۔ ان جنگوں کا نام فجار یعنی نافرمانی یوں پڑا که یه ان مہینوں میں لڑی گئیں جن میں عرب کے مسلمه رواج کے مطابق خون بہانا منع تھا۔ان میں سے ایک جنگ میں قریش بھی فریق تھے ، اس میں آپ بھی شریک ہوے۔ جنگوں کا یه سلسله اتنا ہولناك تھا که قریش کے بہت سے سمجھدار لوگوں نے جنگوں کے مستقل خاتمے کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور امن کے معاہدے کے لئے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں میں حضرت محمدﷺ بھی پیش پیش تھے۔ ان معاہدوں کے بارے میں ابن ہشام نے نبی اکرمؐ کا یه قول نقل کیا ہے:

ما کان من حلف فی الجاهلیه فان الاسلام لم یزده الا شدة۔

یعنی اسلام سے پہلے کا کوئی معاہدہ امن ایسا نہیں جسے
اسلام نے اور زیادہ شدت سے نافذ نه کیا ہو۔

یه نوجوان محمد ہیں جوعبدالله بن جدعان کے گھر میں قریش کے بزرگوں اور جوانوں کے ساتھ حلف الفضول کے معاہدے میں سر گرم نظر آتے ہیں ۔ یه امن و سلامتی اور حق و انصاف کا معاہدہ تھا جو بقول ابن ہشام ایک یمنی تاجر کی فریاد کے جواب میں عمل میں آیا تھا۔ بنو سہل کے ایک با اثر تاجر نے اس یمنی کا مال خریدا لیکن

اس کی قیمت ادا کرنے سے مکر گیا تھا۔ قریش کے جوانوں نے جن میں حضرت محمدؐ بھی تھے حلف الفضول کی یہ انجمن قائم کی تا کہ مظلوموں کو انصاف دلایا جا سکے۔پھر یہی نو جوان محمدؐ ہیں جو خانہ کعبہ میں قریش کے سرداروں کو چادر کے سرے پکڑ اکر اکٹھا کرتے نظر آتے ہیں تا کہ حجر اسود کے نصب میں جھگڑے کو روکا جا سکے۔

اعلان نبوت کے بعد یہی قریش آپ کی مخالفت پر اتر آتے ہیں تو نبی اکرم کی تیرہ سالہ بے مثال سیاست دینیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ حضور کی ذات پر حملہ ہو یا آپ کے ساتھیوں پر ظلم و تشدد، شعب ابی طالب میں محصوری ہو یا طائف کی گلیوں میں پتھروں کی بارش ، اللہ کے محبوب کی زبان پر حرف شکایت نہیں آتا۔ وہ خود بھی صبر کا مظہر اور حلم کا پہاڑ بن جاتا ہے اور اس کے ساتھی بھی۔ اس کو اپنے سچے ہونے پر اتنا یقین ہے کہ اسے کبھی شک نہیں ہوتا کہ آج جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے کل یہی اس کے نام لیواؤں میں شامل ہونے والے ہیں۔یہی عزم و یقین ہے کہ جب قریش کے مسلسل دباؤ سے مجبور ہو کر حضرت ابو طالب نے بھتیجے کو سمجھا نا چاہا تو رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج بھی لا کر رکھ دیں تو میں اپنے فرض سے نہیں ہٹوں گا۔ قریش کی سیاست یہ تھی کہ ابو طالب کو رسول خدا کی حمایت سے روک دیں۔ لیکن ابو طالب نے بھتیجے کا عزم و یقین دیکھا تو ان کی حمایت مزید مستحکم ہو گئی۔

حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد نبی اکرم نے اپنی دعوت کو مزید وسعت دی اور مکہ مکرمہ سے باہر کے لوگوں سے رابطے قائم کرنے شروع کیے۔ آپ نے طائف کا سفر بھی کیا اور صحابہ کرام کی ایک بہت بڑی تعداد کو سمندر پار ملک حبشہ بھی بھیجا۔ انہی رابطوں کے دوران یثرب یعنی مدینہ کے چند قبائل کے نمائندے آپ سے ملے اور آخر کار عقبہ کے دو معاہدوں کے بعد آپ نے مدینہ کی جانب ہجرت کا فیصلہ کیا۔ مدینے کے لوگ بھی مسلسل خانہ جنگیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور امن کی تلاش میں تھے۔ نبی کریم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مدینہ اور اس کے گردو نواح کے لوگوں سے سیاسی معاہدات کا آغاز کیا جو بالآخر میثاق مدینہ پر منتج ہوئے۔ ان

معاہدوں میں مسلم، یہود، اور مشرك سبھی کو شامل کیا گیا۔ ان معاہدات میں شامل قبائل کی دینی اور اقتصادی آزادی کی ضمانت تھی لیکن سب کے لئے ضروری تھا کہ وہ حضور کی سیادت کو تسلیم کریں۔ بعد میں گردو نواح کے عیسائی قبائل بھی ان معاہدوں میں شامل ہوتے گئے۔

جونہی ان معاہدات کے ذریعے مدنی سیاست مضبوط اور مستحکم ہونے لگی قریش مکہ نے اس ابھرتی ریاست کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ جاری کردیا۔ آٹھ سالوں کے اس طویل صبر آزما دور میں سیاست نبوی نے نہ صرف مکی دور کے اصولوں کو تسلسل سے جاری رکھا بلکہ ان نئے حالات میں ان کو وسیع تر معنی دیے۔ مکہ مکرمہ میں صبر کا تقاضا تھا کہ ظلم کے مقابلے میں تلوار نہ اٹھائی جائے۔ اب اس کی اجازت دی گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کسی قوم کی دشمنی میں عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ کیونکہ عدل تقوی کی منزل کو قریب کرتا ہے۔ تقوی دین کی اعلی اقدار میں سے ہے تو عدل اسلامی سیاست کی بنیادی شرط ہے۔ تقوی ہدایت کی شرط اول ہے کہ ھدی للمتقین کو ہی ہدایت نصیب ہوتی ہے تو عدل تقوی کی شرط اول ہے کہ ھی اقرب للتقوی کہ یہ تقوی کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ جنگ کے بارے میں بتایا کہ اصل مقصد امن ہے اگر دوران جنگ دشمن صلح کی بات کرنے لگے تو تم کو اگر یہ اندیشہ بھی ہو کہ اس مین دشمن کی چال ہے تب بھی صلح کو اختیار کرو۔ اگر اس خیال سے تمہارے قدم ڈگمگاتے ہوں کہ تم جیتی ہوئی جنگ ہار رہے ہو یا دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے ہو تو یاد رکھو اللہ پر توکل میں کمزوری دکھانا مکی زندگی کی ساری جدوجہد کی نفی کرنا ہے۔

صلح حدیبیہ سیرت النبی کے اسوہ سیاست کی بھر پور مثال ہے جس میں صبرو برداشت، عدل و انصاف، توکل علی اللہ، دور بینی اور امن و سلامتی کے تمام اصول جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ قریش مکہ جنگوں سے تنگ آئے ہوے تھے اور صلح کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے لیکن اپنی جاہلی انا کو قائم رکھے ہوے تھے۔ مسلمانوں کو جنگوں میں برتری رہی تھی لیکن مسلسل جنگوں‌سے دعوت و تبلیغ اسلام کا کام محدود ہوتا

جا رہا تھا۔ حضورؐ نبی اکرم نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ حج کا زمانہ آچکا تھا، امن و سلامتی کے مہینوں کا زمانہ۔ رسول اکرم نے حج کا ارادہ کیا کہ قریش ان مہینوں میں تو جنگ میں نہیں الجھائیں گے۔ لیکن قریش نے اسے مسلمانوں کی کمزوری سمجھ کر انہیں حج سے منع کر دیا اور جنگ کی دھمکی دی۔ بعد میں جب رسول کریم نے صلح کی پیش کش کی تو قریش ایسی شرطیں پیش کرنے لگے جو بظاہر قریش کی برتری اور مسلمانوں کی شکست کا اظہار تھیں۔ ان شرطوں میں برابری بھی نہیں تھی۔ مثلاً یہ کہ اگر مکہ سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو مسلمان اسے واپس کر دیں گے لیکن اگر کوئی مدینے سے بھاگ کر مکے آئے تو واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو قریش نے اس میں بھی اپنی شرطیں منوائیں۔ یہ ساری شرطیں ایسی تھیں کہ مسلمان ہر شرط پر احتجاج کر رہے تھے لیکن نبی اکرم کی قیادت پر بھروسہ اور اللہ پر توکل ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ پھر یہی ہوا یہ صلح حدیبیہ فتح مبین میں بدل گئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد فتح مبین یعنی امن کا دور شروع ہوا۔ رسول اکرم نے اس وقت کے فرمانرواؤں سے رابطے کئے، خط لکھے، سفیر بھیجے۔ عرب قبائل سے رابطے ہوئے۔ اسلام کی دعوت تیزی سے پھیلنے لگی۔ حتی کہ قریش کو بھی اس دعوت پر غور کرنے کا موقع ملا۔ لوگ دین الہی میں فوج در فوج داخل ہو نے لگے۔ جنگ کے مقابلے میں امن کی طاقت دیکھنے میں آئی۔ صلح کے دس سال پورا ہونے سے پہلے ہی مکہ فتح ہو چکا تھا۔ جزیرہ نمائے عرب اسلام کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ رسول اللہ نے ایک ایسی سیاسی معاشرت کی داغ بیل ڈال دی تھی جو تمام بحرانوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ نبی اکرم نے اس سیاسی معاشرت کے اساسی اصول تو دیے تھے اور اعلی مقاصد کی نشاندہی بھی کر دی تھی لیکن اس کی عہد بہ عہد تشکیل کو امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم کے بعد آپ کے سیاسی جا نشین کا مسئلہ اٹھا جو بظاہر بہت سنگین تھا کیونکہ نبی اکرم کی کوئی واضح ہدایات موجود نہیں تھیں۔ لیکن صحابہ کرام نے اسے خوش اسلوبی سے حل کر لیا۔ اختلافات بعد میں بھی ابھرتے

رہے لیکن ہر دور میں زمان و مکان کی رعایت سے فیصلے ہوتے رہے۔ تا ہم جب بھی امت مسلمہ نے سیاست کو ایک جامع اور دور بیں پالیسی کی بجائے وقتی جوڑ توڑ تک محدود سمجھا تو وہ منزل سے بھٹک گئے۔

سیرت النبیؐ سے سیاست کا جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی معاملات میں واضح پالیسی وضع کرنا ضروری ہے۔ جس میں منزلِ مقصود کا بھی تعین ہو، اعلیٰ اقدار بھی واضح ہوں اور اہداف اور ان کا طریقہ بھی مقرر ہو۔ اعلیٰ اقدار اور مقصود اعلیٰ کے حصول کے لئے ہر سال اور مختلف مراحل کے لئے جو محدود پالیسی متعین ہو اس میں بھی تسلسل اور اعلیٰ اقدار کو فراموش نہ کیا جائے۔ تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے لیکن اس طرح نہیں کہ یہ تسلسل منزلِ مقصود سے دور لے جائے یا اعلیٰ اقدار کے حصول میں رکاوٹ بن جائے۔

hç–ÇÛö] †nÆ ÜãnxÂ kÛÃþ] àm„ö] ½]† ‘ (ÜnÏjŠÛö] ½]† ’ö] ^þ‚â]
!ànö^–ö] Ÿ æ ÜãnxÂ

اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جو تیری نعمتوں سے بہرہ ور ہوے۔ ان لوگوں کے راستے سے دور رکھ جنہوں نے تجھے ناراض کیا اور ان لوگوں کے راستے سے بھی بچا جو منزل سے بھٹک گئے۔

[۲۵ اپریل ۲۰۰۵، محفل عید میلاد النبی، پاکستان مسلم لیگ، اسلام آباد]